بائی فوکل کلب

مُشتاق احمد یُوسفی

چار مہینے ہونے آئے تھے۔ شہر کا کوئی لائق ڈاکٹر بچا ہوگا جس نے ہماری مالی تکالیف میں حسبِ لیاقت اضافہ نہ کیا ہو۔ لیکن بائیں کُہنی کا درد کسی طرح کم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ علاج نے جب شدّت پکڑی اور مرض نے پیچیدہ ہو کر مُفلسی کی صورت اختیار کر لی تو لکھنؤ کے ایک حاذِق طبیب سے رُجوع کیا جو صرف مایوس اور لبِ گور مریضوں پر عملِ مسیحائی کرتے تھے۔ مریض کے جانبر ہونے کا ذرا بھی امکان نظر آئے تو بگڑ جاتے اور اسے دھتکار کر نکلوا دیتے کہ جاؤ، ابھی کچھ دن اور ڈاکٹر سے علاج کراؤ۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں کچھ ایسا اعجاز دیا تھا کہ ایک دفعہ ان سے رُجوع کرنے کے بعد کوئی بیمار خواہ وہ بسترِ مرگ پر ہی کیوں نہ ہو، مرض سے نہیں مرسکتا تھا۔ دوا سے مرتا تھا۔ مرض کے جراثیم کے حق میں تو ان کی دوا گویا آبِ حیات کا حکم رکھتی تھی۔ غریبوں کا علاج مُفت کرتے، مگر رؤسا کو فیس لیے بغیر نہیں مارتے تھے۔ حکیم صاحب اونچا سنتے ہی نہیں، اونچا سمجھتے بھی تھے۔ یعنی صرف مطلب کی بات۔ شاعری بھی کرتے تھے۔ ہم اس پر اعتراض کرنے والے کون؟ لیکن مُصیبت یہ تھی کہ طبابت میں شاعری اور شاعری میں طبابت کے ہاتھ دکھا جاتے تھے۔ مطلب یہ کہ دونوں میں وزن کے پابند نہ تھے۔ حکیموں میں اپنے علاوہ، اُستاد ابراہیم ذوقؔ کے قائل تھے۔ وہ بھی اس بِناء پر کہ بقول آزادؔ، اُستاد نے موسیقی اور نجوم سیکھنے کی سعیِ نامشکُور کے بعد طِبّ کو چند روز کیا۔ مگر اس میں خونِ ناحق نظر آنے لگے۔ چنانچہ انہی صلاحیتوں کا رُخ اردو شاعری کی طرف موڑ دیا۔ حکیم صاحب موصوف اپنی ذات و بیاض پر کامل اعتماد رکھتے تھے۔ ہاں کبھی اپنی ہی ایجاد کردہ معجونِ فلک سَیر کے زیرِ اثر طبیعت فراخدلی و فروتنی پر مائل ہوجائے تو سُخن فہم مریض کے سامنے یہاں تک اعتراف کر لیتے کہ ایک لحاظ سے غالبؔ ان سے بہتر تھا۔ خط اچھّے خاصے لکھ لیتا تھا۔ مگر اب وہ مکتوبِ الیہ کہاں، جنھیں کوئی ایسے خط لکھے۔

خاندانی حکیم تھے۔ اور خاندان بھی ایسا ویسا! ان کے پر دادا قصبہ سندیلہ کے جالینوس تھے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ حکیم جالینوس نابینا و کثیرُ الازدواج نہ تھا۔ یہ تھے۔ نبّاضی میں چار دانگ سندیلہ میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ راویانِ رنگیں بیاں گُزارش کرتے ہیں کہ آبائی حویلی میں چار بیگمات (جن میں ہر ایک چوتھی تھی) اور درجنوں حرّیں اور لونڈیاں رُلی پھرتی تھیں۔ تہجُّد کے وقت وضو کرانے کی ہر ایک کی باری مقرّر تھی، مگر آدھی رات گئے آواز دے کرسب کی نیند خراب نہیں کرتے تھے۔ ہولے سے نبض چھوکر باری والی کو جگا دیتے تھے اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ غلط نبض پر ہاتھ ڈالا ہو۔

نبیرۂ جالینوس نے ہماری نبض، زبان، جگر، پیٹ، ناخن، قارورہ، پپوٹے ــــ مختصر یہ کہ سوائے کُہنی کے ہر چیز کا معائنہ فرمایا۔ فیس کا تعیُّن کرنے سے پہلے ہماری کار کا انجن بھی اسٹارٹ کروا کے بچشمِ خود مُلاحظہ فرمایا اور فیس معاف کر دی۔ پھر بھی احتیاطاً پوچھ لیا کہ مہینے کی آخری تاریخوں میں آنکھوں کے سامنے تِرمِرے ناچتے ہیں؟ ہم نے سر ہلا کر اقرار کیا تو مرض اور اردو زبان کے مزے لوٹتے ہوئے فرمایا کہ دست بخیر! مقامِ ماؤف پر جو درد ہے، درد میں جو چپک ہے، چپک میں جو ٹیس ہے، اور ٹیس میں جو کسک رہ رہ کر محسوس ہوتی ہے، وہ ریاحی ہے!

بقول مرزا، یہ تشخیص نہ تھی، ہمارے مرض کی توہین تھی۔ ہمارے اپنے جراثیم کے مُنہ پر طمانچہ تھا۔ چنانچہ یونانی طِبّ سے رہا سہا اعتقاد چوبیس گھنٹوں کے لیے بالکل اُٹھ گیا۔ ان چوبیس گھنٹوں میں ہم نے کُہنی کا ہر زاویے سے ایکس رے کرایا۔ لیکن اس سے مایوسی اور بڑھی۔ اس لیے کہ کُہنی میں کوئی خرابی نہیں نکلی !

پورے دو مہینے مرض میں ہندو یوگ آسَن اور میتھی کے ساگ کا اضافہ کرنے کے بعد ہم نے مرزا سے جا کر کیفیت بیان کی۔ استماعِ حال کے بعد ہماری دائیں چپنی پر دو اُنگلیاں رکھ کر انہوں نے نبض دیکھی۔ ہم نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا تو بولے، چالیس سال بعد مرد کا دل نیچے اُتر آتا ہے ! پھر فرمایا، تمہارا علاج یہ ہے کہ فوراً بائی فوکل[1] بنوا لو۔ ہم نے کہا مرزا! تم تو شراب بھی نہیں پیتے۔ کُہنی کا آنکھ سے کیا تعلّق؟ بولے، چار پانچ مہینے سے دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری پاس کی نظر بھی خراب ہوگئی ہے۔ کتاب نزدیک ہو تو تم پڑھ نہیں سکتے۔ تقاضائے سِن ہی کہنا چاہیے۔ تم اخبار اور کتاب کو آنکھ سے تین فٹ دور بائیں ہاتھ میں پکڑ کے پڑھتے ہو۔ اسی لیے ہاتھ کے پٹھّے اکڑ گئے ہیں۔ چنانچہ کُہنی میں جو درد ہے، درد میں جو ----- الخ۔

مانا کہ مرزا ہمارے مونس و غم خوار ہیں، لیکن ان کے سامنے افشائے مرض کرتے ہوئے ہمیں ہول آتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے فقیری چٹکلوں سے اصل مرض کو تو جڑ بنیاد سے اُکھیڑ کر پھینک دیتے ہیں، لیکن تین چار نئے مرض گلے پڑ جاتے ہیں، جن کے لیے پھر انہی سے رُجوع کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ ہر دفعہ اپنے علاج سے ہر مرض کو چار سے ضرب دیتے چلے جاتے ہیں۔ فائدہ اس طریق علاج کا یہ ہے کہ شفائے جُزوی کے بعد جی پھر علالتِ اصلی کے رات دن ڈھونڈتا ہے۔ اور مریض کو اپنے مُفرد مرض کے مرحوم جراثیم بے طرح یاد آتے ہیں اور وہ ان کی شفقتوں کو یاد کرکر کے روتا ہے۔ کچھ دنوں کی بات ہے۔ ہم نے کہا، مرزا! تین چار مہینے سے ہمیں تکیے پر صُبح درجنوں سفید بال پڑے ملتے ہیں۔ فرمایا، اپنے تکیے پر؟ عرض کیا ہاں! شرلاک ہومز کے مخصوص جاسوسی انداز میں چند منٹ گہرے غور و خوض کے بعد فرمایا، غالباً تمہارے ہوں گے۔ ہم نے کہا، ہمیں بھی یہی شُبہ ہوا تھا۔ بولے، بھائی میرے! تم نے تمام عمر ضبط و احتیاط سے کام لیا ہے۔ اپنے نجی جذبات کو ہمیشہ شرعی حُدود میں رکھا ہے۔ اسی لیے تم 38 سال کی عمر میں گنجے ہو گئے ہو! اس تشخیص کے بعد انہوں نے ایک روغنی خضاب کا نام بتایا، جس سے بال کالے اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چلتے وقت انہوں نے ہمیں سختی سے خبردار کیا کہ تیل برش سے لگایا جائے ورنہ ہتھیلی پر بھی بال نکل آئیں گے، جس کے وہ اور دوا ساز کمپنی ہرگز ہرگز ذمّہ دار نہ ہوں گے۔ واپسی میں ہم نے انتہائی بے صبری کے عالم میں سب سے بڑے سائز کی شیشی خریدی اور دُکاندار سے ریزگاری بھی واپس نہ لی کہ اس میں سراسر وقت کا ضیاع تھا۔ چالیس دن کے مسلسل استعمال سے یہ اثر ہوا کہ سر پر جتنے بھی کالے بال تھے، وہ تو ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔ البتّہ جتنے سفید بال تھے، وہ بالکل مضبوط ہو گئے۔ چنانچہ آج تک ایک سفید بال نہیں گرا، بلکہ جہاں پہلے ایک سفید بال تھا، وہاں اب تین نکل آئے ہیں۔

بائی فوکل کا نام آتے ہی ہم سنبھل کے بیٹھ گئے۔ ہم نے کہا، مرزا! مگر ہم تو ابھی چالیس سال کے نہیں ہوئے۔ بولے، مرض کے جراثیم پڑھے لکھے نہیں ہوتے کہ کیلنڈر دیکھ کر حملہ کریں۔ ذرا حال تو دیکھو اپنا۔ صحت ایسی کہ بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ نام سے بھاگتے ہیں۔ صورت ایسی جیسے، معاف کرنا، ریڈیو فوٹو۔ اور رنگ بھی اب گندمی نہیں رہا۔ خوف الٰہی و اہلیہ سے زرد ہو گیا ہے۔ اگر کبھی یاروں کی بات مان لیتے تو

---

[1] ۔ بائی فوکل اُس عینک کو کہتے ہیں، جس میں دو شیشے اوپر نیچے جڑے ہوں۔ اوپر والا شیشہ دور کی چیزیں دیکھنے کے لیے اور نچلا صرف پڑھنے کے لیے۔ایسی عینک کی ضرورت عام طور پر آدھی عمر، اِدھر، آدھی عمر اُدھر، یعنی چالیس برس کے بعد پڑتی ہے۔ اللہ کے خاص بندوں پر البتّہ یہ عجب وقت پہلے بھی آن پڑتا ہے۔

زندگی سنور جاتی۔ ہم نے کہا، ہمارا جو حال ہے وہ تنہا ایک آدمی کے غلط فیصلوں سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہمیں تو اس میں پوری قوم کا ہاتھ نظر آتا ہے! فرمایا، جاپان میں فنِ باغبانی کے ایک مخصوص شُعبے بونسائی کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے ماہر پُشت در پُشت درختوں کو اس چاؤ چونچلے سے اگاتے اور سینچتے ہیں اور ان کی اُٹھان کو اس طرح قابو میں رکھتے ہیں کہ تین تین سو سال پرانے درخت میں پھل پھول بھی آتے ہیں، پت جھڑ بھی ہوتا ہے، مگر ایک بالِشت سے اونچا نہیں ہونے پاتا۔ تم نے اپنی شخصیت کو اسی طرح پالا پوسا ہے۔

ہم نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا، مرزا! ہم ایسے نہ ہوتے تو تم کسے نصیحت کرتے؟ کچھ نرم پڑے۔ فرمایا نصیحت سے غرض اصلاح کس مسخرے کو ہے۔ مگر تم نے دماغ سے کبھی کام نہیں لیا۔ خالی چال چلن کے برتے پرساری زندگی گُزار دی۔ ہم نے کہا، مرزا! تم تو یہ نہ کہو۔ ہم تمام عمر اپنی خواہشات سے گوریلا جنگ کرتے رہے ہیں۔ تم ہمارے دل کے کھوٹ سے واقف ہو۔ یہ آتشِ شوق

پوری بُجھی نہیں، یہ بُجھائی ہوئی سی ہے

جہاں تک اعمال کا تعلق ہے، خُدا شاہد ہے کہ ہمارا کوئی کام، کوئی عمل خلافِ شرع نہیں۔ لیکن اگر جنّت و دوزخ کا فیصلہ فقط نیّت کی بناء پر ہوا تو ہمارے دوزخ میں جانے میں خود ہمیں کو شُبہ نظر نہیں آتا۔ مسکرا دیے۔ فرمایا، جن خواتین نے اپنی خوبصورتی سے تمہارے دھیان گیان میں خلل ڈالا، ان کی تعداد، کچھ نہیں تو، کراچی کی نصف آبادی کے برابر تو ہو گی؟

ہم نے مرزا کو یاد دلایا کہ لڑکپن ہی سے ہم پُر امن زندگی بسر کرنے کے سخت خلاف رہے ہیں۔ مار دھاڑ سے بھرپور جیمس بانڈ جیسی زندگی گُزارنے کی خاطر کیسے کیسے جتن کیے۔ انہیں تو کیا یاد ہوگا، قاضی عبدُ القُدُّوس ان دنوں ہمیں Bull Fighting کی ٹریننگ دیا کرتے تھے اور ایک داڑھی دار بوک بکرے کو سرخ ترکی ٹوپی پہنا کر، ہمیں اس کے خلاف اشتعال دلایا کرتے تھے۔ مڈل میں ۳۳ نمبر سے حساب میں فیل ہونے کے بعد ہم نے ذریعہ معاش کے بارے میں یہ فیصلہ کیا کہ والدہ اجازت دے دیں تو pirate (بحری قزّاق) بن جائیں۔ لیکن جب سنِ شعور کو پہنچے اور انگریز حکمرانوں سے نفرت کے ساتھ ساتھ نیک و بد کی تمیز بھی پیدا ہوئی تو زندگی کے نصبُ العین میں، مرزا ہی کے مشورے سے، اتنی اصلاح کرنی پڑی کہ صرف انگریزوں کے جہازوں کو لوٹیں گے۔ مگر ان کی میموں کے ساتھ بدسلوکی نہیں کریں گے۔ نکاح کریں گے۔

فرمایا ''یہ سب علامتیں 'مڈل ایج' کی ہیں، جو تمہارے کیس میں ذرا سویرے ہی آ گئی ہے۔ ایک روسی انارکسٹ نے ایک دفعہ کیا اچھی تجویز پیش کی تھی کہ 25 سال سے زائد عمر والوں کو پھانسی دے دی جائے۔ لیکن پھانسی سے زیادہ عبرت ناک سزا تم جیسوں کے لیے یہ ہوگی کہ تمہیں زندہ رہنے دیا جائے۔ 'مڈل ایج' کا بجَز پیری، کوئی علاج نہیں۔ ہاں تنگ دستی اور تصوُّف سے تھوڑا بہت آرام آ جاتا ہے۔ ہمارے یہاں سنِ یاس کے، لے دے کے، دو ہی مشغلے ہیں۔ عیاشی ــ اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو ــ تصوُّف! اور قوّالی ان دونوں کا عطر فتنہ ہے!

''اور تمہارا علاج ہے، ایک عدد بائی فوکل اور جُمعرات کی جُمعرات قوّالی! دو دن سے سائیں گُلمبر شاہ کا عُرس ہو رہا ہے۔ آج رات بھی ہمارے پیر صاحب قبلہ نے محفلِ سماع کا اہتمام فرمایا ہے۔ مٹکے والے قوّالوں کی چوکی کے علاوہ حیدرآباد کی ایک طوائف بھی ہدیۂ نیاز پیش کرے گی۔'' ہم نے پوچھا '' زندہ طوائف؟'' بولے، ''ہاں! سچ مچ کی! مرے کیوں جا رہے ہو؟ شین قاف کے علاوہ نک سِک سے بھی دُرست۔

حضرت سے بیعت ہونے کے بعد اس نے شادی بیاہ کے مُجروں سے توبہ کرلی ہے۔ اب صرف مزاروں پر گاتی ہے یا ریڈیو پاکستان سے! اور صاحب! ایسا گاتی ہے، ایسا گاتی ہے کہ گھنٹوں دیکھتے رہو! ہنستے کیا ہو۔ ایک نکتہ آج بتائے دیتے ہیں ــ گانے والی کی صورت اچّھی ہو، تو مُہمل شعر کا مطلب بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔''

عشاء کے بعد ہم نے قوّالی کی تیاریاں شروع کیں۔ عید گا کرتھا ہوا کرتا پہنا۔ جمعہ کی نماز والے خاص جوتے نکالے۔ (مسجد میں ہم کبھی عام جوتے پہن کر نہیں جاتے۔ اس لیے کہ جوتے اگر ثابت ہوں تو سجدے میں بھی دل انہیں میں پڑا رہتا ہے) مرزا ہمیں لینے آئے تو نَتھنے پھڑکاتے ہوئے دریافت کیا کہ آج تم میں سے جنازے کی سی بُو کیوں آرہی ہے؟ ہم نے گھبرا کر اپنی نبض دیکھی۔ دل تو ابھی دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بات سمجھ میں آئی تو ہم نے اقرار کیا کہ گرم شیروانی دو سال بعد نکالی ہے۔ کافوری گولیوں کی بُو بُری طرح بَس گئی تھی۔ اسے دبانے کے لیے تھوڑا سا حِنا کا عطر لگا لیا ہے۔ کہنے لگے، جہاں آدابِ محفل کا اتنا لحاظ رکھا ہے، وہاں اتنا اور کرو کہ ایک ایک روپے کے نوٹ اندر کی جیب میں ڈال لو۔ ہم نے پوچھا کیوں؟ فرمایا، جو شعر تمہاری یا میری سمجھ میں آجائے، اس پر ایک نوٹ ادب کے ساتھ نذر کرنا۔ چنانچہ تمام رات ہماری یہ دُہری ڈیوٹی رہی کہ دامِ شُنیدن بچھائے بیٹھے رہیں اور اس شغلِ شبینہ کے دوران مرزا کے چہرے پر بھی مستقل نظر جمائے رہیں کہ جوں ہی ان کے نتھنوں[1] سے ہویدا ہو کہ شعر سمجھ میں آگیا ہے، اپنی ہتھیلی پہ نوٹ رکھ کر پیر و مُرشد کو نذر گُزرانیں اور وہ اسے چُھوکر قوّالوں کو بخش دیں۔

اپنی ذات سے مایوس لوگوں کا اس سے زیادہ نُمائندہ اجتماع ہم نے اپنے چالیس سالہ تجربے میں نہیں دیکھا۔ شہر کے چوٹی کے ادھیڑ یہاں موجود تھے، ذرا دیر بعد پیر صاحب تشریف لائے۔ بھاری بدن۔ نیند میں بھری ہوئی آنکھیں۔ چھاج سی داڑھی۔ کترواں لبیں۔ ٹخنوں تک گیروا کرتا۔ سرپر سیاہ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی، جس کے نیچے روپہلی بالوں کی کگر۔ ہاتھ میں سبز جریب۔ ساز ملائے گئے۔ یعنی ہارمونیم کو تالیوں سے اور تالیوں کو مٹکے سے ملایا گیا۔ اور جب کلامِ شاعر کو ان تینوں کے تابع کر لیا گیا تو قوّالی کا رنگ جما۔ ہمارا خیال ہے کہ اس پائے کے مغنّیوں کو تو مُغلوں کے زمانے میں پیدا ہونا چاہیے تھا، تاکہ کوئی بادشاہ انہیں ہاتھی کے پاؤں تلے رُندوا ڈالتا۔ انہوں نے مولانا جامیؔ کے کلام میں میرا بائی کے دوہوں کو اس طرح شیرو شکر کیا کہ فارسی زبان سراسر مارواڑی بولی ہی کی بگڑی ہوئی شکل معلُوم ہونے لگی۔ اور ہم جیسے بے علمے کو تو اصل پر نقل کا دھوکا ہونے لگا۔

قوّالی شروع ہُوئی ہے تو ہم پانچویں صف میں دو زانو بیٹھے تھے۔ نہیں، محض دو زانو نہیں۔ اس طرح بیٹھے تھے جیسے التّحیات پڑھتے وقت بیٹھتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی محفل رنگ پر آئی، ہم حال کھیلنے والوں کے دھکّے کھاتے کھاتے اتنے آگے نکل گئے کہ رات بھر ٹانگیں غُلیل کی طرح پھیلائے ایک ہارمونیم کو گود میں لیے بیٹھے رہے۔ ایک نووارد نے ہمیں ایک روپیہ بھی دیا۔ ہمارا حشر یعنی چائے پانی بھی قوّالوں کے ساتھ ہوا۔ دھکّوں کے ریلے میں ہم قوّالوں کی ٹولی کو چیرتے ہوئے دوسرے دروازے سے کبھی کے باہر نکل پڑے ہوتے، مگر بڑی خیریت گُزری کہ ایک کلارینٹ نے ہمیں بڑی مضبوطی سے روکے رکھا۔ یہ کلارینٹ کوئی سَوا گز لمبا ہو گا۔ اس کا بے ضرر سِرا تو سازندے کے مُنہ میں تھا، لیکن پَھن ہمارے کان میں ایسا فٹ ہو گیا تھا کہ زور کے دھکّوں کے باوجود ہم ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔

۱۔ مزاج داں جانتے ہیں کہ مُہمل شعر سمجھ میں آجائے تو مرزا کے نتھنے خرگوش کی طرح پھڑکنے لگتے ہیں۔[1]

آخرِ شب حضرت نے بطورِ خاص فرمائش کرکے طوائف سے اپنی ایک، بحر سے خارج غزل گوائی، جسے اُس غیرتِ ناہید نے سُر تال سے بھی خارج کر کے سہ آتشہ کر دیا۔ حضرت اپنا کلام سُن کر اس قدر آبدیدہ ہوئے کہ چھپا ہوا رومال (جس کے حاشیے پر چند اشعار کھانے کی فضیلت میں رقم تھے) تر ہوگیا۔ مقطع جی توڑ کر گایا اور زباں پہ بارِ خدایا شاعر کا نام آیا تو ناچتے ہوئے جا کر سر سامنے کر دیا۔ حضرت نے از راہِ پرورش اصلی چھوہارے کی گٹھلیوں کی ہزار دانہ تسبیح اپنے دستِ غنا آلود سے اس کے گلے میں ڈال دی۔ اور اپنی خاکِ پا اور حُجرۂ خاص کی جاروب بھی مرحمت فرمائی۔ چار بجے جب سب کی جیبیں خالی ہوگئیں تو بیشتر کو حال آگیا۔ اور ایسی دھمال مچی کہ تکیہ کے گُنبد کی ساری چمگا دڑیں اُڑ گئیں۔ کسی کے پاؤں کی ضربِ مستانہ سے حضرت کے خلیفہ کی گھڑی کا شیشہ چُور چُور ہوگیا اور اب وہ بھی اپنی دستارِ خلافت، جُبّہ، بائی فوکل اور چاندی کے بٹن اُتار کر میدان میں کود پڑے۔ صرف انگوٹھی اور موزے نہیں اُتارے۔ سو وہ بھی بحالت مستی کسی نے اُتار لیے۔ نوٹوں کی بوچھار بند ہوئی اور اب ہر بیت پر جزاک اللہ کا غلغلہ بلند ہونے لگا۔ اس بھاگ بھری نے جو دیکھا کہ بندوں نے اپنا ہاتھ کھینچ کر اب معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا ہے تو جھٹ آخری گلوری کلّے میں دبا کے کہروے پر محفل ختم کر دی۔

پانچ بجے صُبح ہم کان سہلاتے محفلِ سمع خراشی سے لوٹے۔ کچھ مُہمل کلام کا، کچھ خود رفتگیِ شب کا خمار، ہم ایسے غافل سوئے کہ صبح دس بجے تک سنّاتے رہے۔ اور بیگم ہمارے پلنگ کے گرد منڈلاتے ہوئے بچوں کو سمجھاتی رہیں "کمبختو! آہستہ آہستہ شور مچاؤ۔ ابا سو رہے ہیں۔ رات بھر اُس منحوس مرزا کی مُصاحبی کی ہے۔ آج دفتر نہیں جائیں گے۔ اری او نبیلہ کی بچّی! گھڑی گھڑی دروازہ مت کھول۔ مکّھیوں کے ساتھ ان کے مَلاقاتی بھی گُھس آئیں گے۔" شام کو مرزا چلتے پھرتے ادھر آنکلے اور (وہ روحانی طمانیت اور رونق دیکھ کر جو ہمارے مُنہ پر دفتری فرائض ادا نہ کرنے سے آ جاتی ہے) کہنے لگے، "دیکھا! ہم نہ کہتے تھے ایک ہی صحبت میں رنگ نکھر آیا۔ رات حضرت نے توجّہ فرمائی؟ قلب پر کوئی اثر مرتّب ہوا؟ رؤیا ہوا؟" ہم نے کہا، "رؤیا ورؤیا تو ہم جانتے نہیں۔ البتّہ صُبح ایک عجیب و غریب خواب دیکھا کہ بغداد میں سفید سنگِ مرمر کی ایک عالیشان محل سرا ہے، جس کے صدر دروازے پر قومی پرچم کی جگہ ایک "بیکنی" لہرا رہی ہے۔ چھت وینس ڈی ملو کے مجسّموں پر ٹھہری ہوئی ہے۔ حمّام کی دیواریں شفّاف بِلّور کی ہیں۔ مرکزی قالین کے گِردا گِرد غیر محفُوظ فصل سے مُخملی گاؤ تکیوں کی جگہ تنک لباس کنیزیں آڑی لیٹی ہیں اور شُیوخ ان کی گُداز ٹیک لگائے، ایک دوسرے کے گاؤ تکیے کو آنکھ مار رہے ہیں۔ سامنے ایک زنِ پُر فن نقّاروں پر، اپنی آنکھیں انجیر کے پتّے سے ڈھانپے، برہنہ رقص کر رہی ہے اور پاؤں سے انہی نقّاروں پر تال دیتی جاتی ہے۔ دل بھی اسی تال کے مطابق دھڑک رہے ہیں۔ غرض کہ ایک عالم ہے۔ اُمراء کے آزو بازو کنیزوں اور پیش خدمتوں کے پَرے کے پَرے منتظر ہیں کہ ابروئے طلب کی جُنبشِ نیم شَبی پر اپنی لذتیں اس پر تمام کر دیں۔ یہ وقفہ وقفہ سے شراب، کباب اور اپنے آپ کو پیش کرتی ہیں۔ اسی قالین کے سیاہ حاشیے پر چالیس غُلام ہاتھ باندھے، نظریں جھکائے کھڑے ہیں۔ اور میں ان میں سے ایک ہوں!

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بُزرگ، بھاری بدن، نیند میں بھری ہوئی آنکھیں۔ داڑھی اتنی لمبی کہ ٹائی لگائیں تو نظر نہ آئے۔ سبز جریب ٹیکے آ رہے ہیں۔ ہم نے اپنی ہتھیلی پر سو روپے کا نوٹ رکھ کر پیش کیا۔ حضرت نے نوٹ اُٹھا کر وہ جگہ چُومی، جہاں نوٹ رکھا تھا اور بشارت دی کہ بارہ برس بعد تیرے بھی دن پھر جائیں گے۔ تو باون سال کی عمر میں ایک بھرے پُرے حرم کا مالک ------ "

مرزا کا چہرہ لال انگارہ ہو گیا۔ قطع کلام کرتے ہوئے فرمایا:

''تم جسم شاعر کا، مگر جذبات گھوڑے کے رکھتے ہو!''

پھر انہوں نے لعن طعن کے وہ دفتر کھولے کہ عاجز نے کھڑے کھڑے تمام ملکیوں کو، مع لباسِ مختصر، حرم سے نکال باہر کیا۔تین نووارد گیشائیں تھیں کہ جن کے ویزا کی ابھی آدھی مدّت بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ کیسے کہوں کہ انہیں بھی اس ہڑبونگ میں زاد راہ دیے بغیر نکال دیا ! اور ان کے ساتھ ساتھ تصوُّف کا خیال بھی ہمیشہ ہمیش کے لیے دل سے نکال دیا۔

قلبِ سیاہ پر قوّالوں کے تصرُّفاتِ باطنی آپ مُلاحظہ فرما چکے ۔ اب بائی فوکل کا حال سُنیے۔ عینک ہمارے لیے نئی چیز نہیں۔ اس لیے کہ پانچویں جماعت میں قدم رکھنے سے پہلے ہماری عینک کا نمبر 7 ہو گیا تھا۔ جو قارئین ننگی آنکھ (انگریزی ترکیب ہے، مگر خوب ہے) سے دیکھنے کے عادی ہیں انہیں شاید اندازہ نہ ہو کہ 7 نمبر عینک کیا معنی رکھتی ہے۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ اندھا بھینسا کھیلتے وقت بچے ہماری آنکھوں پر پٹّی نہیں باندھتے تھے۔ ہمارا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ناک صرف اس لیے بنائی ہے کہ عینک ٹِک سکے۔ اور جو بچارے عینک سے محروم ہیں، ان کی ناک محض زُکام کے لیے ہے ----- دادا جان قبلہ کا عقیدہ تھا کہ عربی نہ پڑھنے کے سبب سے ہم نِصف نابینا ہوگئے ہیں۔ ورنہ اس معزّز خاندان[1] کی تاریخ میں ڈیڑھ سو سال سے کسی بُزرگ نے عینک نہیں لگائی۔ اللہ اللہ! سستا سماں اور کیسے سادہ دل بُزرگ تھے کہ گرلز پرائمری اسکول کی بس کا راستہ کاٹنے کو تماش بینی گردانتے تھے! آج ہمیں اس کا مَلال نہیں کہ وہ ایسا کیوں سمجھتے تھے، بلکہ اس کا ہے کہ ہم خود یہی کچھ سمجھ کر جایا کرتے تھے! اور جب ہم چوری کی چوٹّی سے بائیسکوپ دیکھ کر رات کے دس بجے پنجوں کے بل گھر میں داخل ہوتے تو ڈیوڑھی میں ہمیں خاندان کے تمام بُزرگ نہ صرف خود گارڈ آف آنر دیتے، بلکہ اپنی کمک پر بیرونی بوڑھوں کو بھی بلا لیتے تھے کہ مقابلہ ہمارے فِسق و فجور سے تھا۔

عینک پر پھبتیاں سُنتے سُنتے ہمارا کمسِن کلیجہ چھلنی ہوگیا تھا۔ لہٰذا دوسال بعد جب دادا جان کا موتیا بند کا آپریشن ہوا تو ہم نے اس خوشی میں بچّوں کو لیمن ڈراپ تقسیم کیں۔ دراصل ہم سب بچے انہیں "پرابلم " بُزرگ سمجھا کرتے تھے۔ وہم کے مریض تھے۔ آپریشن سے پہلے مصنُوعی بتّیسی کے ایک اگلے دانت میں درد محسوس کر رہے تھے، جس کا علاج ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے کرانے کے بعد، انہوں نے وہ دانت ہی اُکھڑوا دیا تھا۔ اور اب اس کی کھڈّی میں حُقّے کی نُقرئی مُہنال فٹ کر کے گھنٹوں ہمارے تاریک مُستقبل کے بارے میں سوچا کرتے تھے۔ ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ آپریشن کے بعد وہ آدھ اِنچ موٹے شیشے کی عینک لگانے لگے تھے، جس سے ان کی غُصّیلی آنکھیں ہم بچّوں کو تگُنی بڑی دکھائی دیتی تھیں۔ اللہ جانے خود انہیں بھی اس سے کچھ دکھائی دیتا تھا یا نہیں۔ اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوتا تھا کہ اسی زمانے میں ابّا جان چوکیداری کے لیے ایک سُنہری رنگ کا بوڑھا کُتّا لے آئے تھے، جسے کم نظر آتا تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دادا جان کو کُتّا اور کُتّے کو وہ نظر نہیں آتے تھے۔ ہماری یہ ڈیوٹی لگی ہوئی تھی کہ ہر دو فریقین کو ایک دوسرے کے حلقۂ گرند سے دور رکھیں۔ بالخصُوص مغرب کے وقت۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ ہماری غفلت سے وہ وضو کر کے ہرن کی کھال کے بجائے کُتّے پر بیٹھ جاتے اور مؤخر الذّکر، اوّل الذّکر پر بھونکنے لگتا تو وہ راقم الحُروف پر چیختے کہ اندھا ہو گیا ہے کیا؟ عینک لگا کے بھی اتنا بڑا کُتّا نظر نہیں آتا!

۱۔ معزّز خاندان: جس کا سلسلہء نسب ڈیڑھ دو لاکھ واسطوں سے حضرت آدم علیہ السّلام سے جا ملتا ہے۔[1]

دعویٰ تو مرزا اور عینک ساز دونوں نے یہی کیا تھا کہ بالائی غُرفے سے دور کی اور زیریں غُرفے سے پاس کی چیزیں صاف نظر آئیں گی۔ پروفیسر قاضی عبد القدُّوس نے تو یہاں تک اُمیّد بندھائی تھی کہ دور کے شیشے سے اپنی بیوی اور پاس کے شیشے سے دوسرے کی بیوی کا چہرہ نہایت بھلا معلُوم ہو گا۔

غافِل نے اِدھر دیکھا، عاقِل نے اُدھر دیکھا

لیکن قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کے بعد کھلا کہ بائی فوکل سے نہ دور کا جلوہ نظر آتا ہے نہ پاس کا۔ البتہّ صبر آجاتا ہے۔ یہاں تک تو بَسا غنیمت ہے کہ ہم بندُوق کی سبھی نچلے شیشے اور مکّھی اوپر والے شیشے سے مُلاحَظہ فرمائیں۔ اور اگر تیتر بندُوق کی نال میں چونچ ڈالے کارتُوس کا مُعائنہ کر رہا ہے تو پھر بچ کے نہیں جاسکتا۔ خیر، شکار کو جانے دیجئے کہ یوں بھی ہم جیو ہتّیا کے خلاف ہوگئے ہیں۔ (زین بدھ ازم اور اہِنسا کی تعلیمات سے قلب ایسا رقیق ہُوا ہے کہ اب دلی خواہش یہی ہے کہ خوبصورت پرند کو جان سے مارے بغیر اس کا گوشت کھاسکیں۔) لیکن زینہ سے اُترتے وقت

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے

اور جہاں پاؤں پڑتا ہے، وہاں سیڑھی نہیں ہوتی۔ مرزا سے اس صُورت خاص کا ذکر کیا تو کہنے لگے کہ عینک ہر وقت لگائے رکھو۔ لیکن جہاں نظر کا کام ہو، وہاں ایک خوبصُورت سی چھڑی ہاتھ میں رکھا کرو۔ لاہور میں عام ملتی ہیں۔ ہم نے کہا، لاہور میں جو خوب صورت چھڑیاں عام ملتی ہیں، وہ ہمارے شانے تک آتی ہیں۔ ہم انہیں ہاتھ میں نہیں رکھ سکتے۔ بغل میں بیساکھی کی طرح دبائے پھر سکتے ہیں۔ مگر لالہ رُخسارانِ لاہور اپنے دل میں کیا کہیں گے؟ بولے، تو پھر ایک کُتّا ساتھ رکھا کرو۔ تمہاری طرح وفا دار نہ ہو تو مضائقہ نہیں، لیکن نابینا نہ ہو۔

ہم نو اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شاہان سلف، بالخصوص بعض مغل فرماں روا، اپنے سرکش صوبیداروں، شورہ پشت شہزادوں اور تخت و تاج کے دعویدار بھائیوں کی جلاد سے آنکھیں نکلوا کر خود کو تاریخ ہند مؤلفہ ایشوری پرشاد میں خواہ مخواہ رسوا کر گئے۔ ان سب کو (بشمول ایشوری پرشاد) بائی فوکل لگوا دیتے تو اوروں کو کان ہو جاتے اور یہ دکھیارے بھیک مانگنے کے لائق بھی نہ رہتے۔ ہمارا خیال ہے کہ نہ دیکھنے کا اس سے زیادہ سائنٹیفک آلہ آج تک ایجاد نہیں ہوا۔ ذرا کھل کر بات کرنے کی اجازت ہو تو ہم یہاں تک کہہ گزریں گے کہ بائی فوکل عفت نگاہ کا ضامن ہے۔ مثلاً عینک کے بالائی حصے سے مقابل بیٹھے ہوئے بت سیم تن کے سرتاج کی جبر جنگ مونچھ کا ایک ایک بال گنا جا سکتا ہے، لیکن جب ریشمی ساری ہمارے ہی رخ سرک کر پنڈلی سے اوپر یوں چڑھ جائے کہ

نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے، کبھی تو دیکھے گا

تو صاحب! اس بے حیائی کا مُطالعہ یکسُوئی سے نہ اوپر کے شیشے سے کیا جا سکتا ہے، نہ نیچے کے شیشے سے۔ اور یوں گرہستی آدمی ایک گُناہ سے بچ جاتا ہے

وہ اک گُنہ جو بظاہر گُناہ سے کم ہے

اتنا ضرور ہے کہ اسے لگانے کے بعد مزید تین عینکوں کا اہتمام لازم آتا ہے۔ ایک دور کی۔ دوسری پاس کی اور تیسری بغیر شیشوں والی ــ دیکھنے کے لیے۔ یہ آلاتِ تشدُّد اس لئے بھی ضروری ہیں کہ یوں دکھانے کے ادھیڑ آدمی کے مُنھ پر آنکھ، آنکھ میں پتلی، پتلی میں تل اور تل میں غالباً بینائی بھی ہوتی ہے، لیکن تین سے پانچ فٹ دور کی چیز کسی طور بائی فوکل کے فوکس میں نہیں آتی۔ ایک سانحہ ہو تو بیان کریں۔ پرسوں رات دعوت ولیمہ میں جس چیز کا ڈونگا سمجھ کر ہم نے جَھپا جَھپ اس میں سے پُلاؤ کی ساری بوٹیاں گرالیں، وہ ایک مولوی صاحب کی پلیٹ نکلی جو خود اس وقت زردے کی کِشتی پر بُری نظر ڈال رہے تھے۔ یاکل رات گھپ اندھیرے سنیما حال میں انٹرول (جسے مرزا وقفہء تاک جھانک کہتے ہیں) کے بعد شانے پر ہاتھ رکھے، جس سیٹ تک پہنچنے کی کوشش کی، وہ سیٹ ہماری نہیں نکلی۔ اور نہ وہ شانہ ہماری اہلیہؔ کا ! انسان کی کوئی محرُومی خالی از حِکمَت نہیں۔ جیسے جیسے کچھ درد بقدر ہماری تاب و تحمُّل کے ہمیں عطا ہوتا ہے، قلب بصیرتوں سے گُداز ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انسان جب چشم و گوش کا محتاج نہ رہے اور اسے انکل سے زندگی گزارنے کا ہُنر آ جائے تو صحیح معنوں میں نظم و ضبط کا آغاز ہوتا ہے۔ مرزا کے علاوہ بھلا یہ اور کس کا قول ہو سکتا ہے کہ کایا کا سُکھ چاہو تو جوانی میں بہرے بن جاؤ اور بُڑھاپے میں اندھے۔ ہَوَسِ سیر و تماشا تو خیر پُرانی بات ہوئی، ہم تو اب بینائی کا بھی ہٹُکا نہیں کرتے۔ ہو ہو، نہ ہو نہ ہو۔ اب تو ہر چیز کو اپنی جگہ رکھنے کی عادت پڑگئی ہے۔ الماری میں دائیں طرف پتلُون، بائیں طرف پُرانی قمیض جنہیں اب صِرف بند گلے کے سوئٹر کے نیچے پہن سکتے ہیں۔ دوسرے خانے میں سلیقے سے تہ کیا ہوا بند گلے کا سوئٹر جو اب صِرف بند گلے کے کوٹ کے نیچے پہنا جا سکتا ہے۔ آنکھ بند کر کے جو چاہو، نکال لو۔ غرض کہ ہر چیز کا اپنا مُقام بن جاتا ہے جا نماز کی جگہ جا نماز۔ رقّت انگیز ناول کی جگہ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی چیک بک۔ محبُوبہ کی جگہ منکُوحہ ــ تکیہ کی جگہ گاؤ تکیہ! ذرا ترتیب بگڑی اور آبروئے شیوۂ اہلِ نظرگئی۔ لیکن جس گھر میں بِفضلہ تین بچّے ہوں وہاں یہ رکھ رکھاؤ ممکن نہیں۔ اور رکھ رکھاؤ تو ہم نے تکلفاً کہہ دیا ورنہ سچ پوچھیے تو کچھ بھی ممکن نہیں۔

دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے

ایک دن ہم نے جُھنجھلاکر بیگم سے کہا، یہ کیا اَندھیر ہے۔ تمہارے لاڈلے ہر چیز جگہ سے بے جگہ کر دیتے ہیں۔ کل سے چاقو غائب تھا۔ ابھی عُقدہ کُھلا کہ اس سے گُڑیا کا اپینڈکس نکالا گیا تھا! تنک کر بولیں، اور کیا کُلہاڑی سے گُڑیا کا پیٹ چیرا جاتا؟ ہم نے جھٹ ان کی رائے سے اتّفاق کرتے ہوئے کہا، ہاں! یہ کیسے ممکن ہے۔ اس لئے کہ کُلہاڑی کے ڈنڈے سے تو اس گھر میں کپڑے دھوئے جاتے ہیں! تم ہی بتاؤ، صبح تازہ مضمون کی ناؤ بلکہ پورا بیڑا ئب میں صفحہ وار نہیں چل رہا تھا؟ تمہارے گھر میں ہر ایک چیز کا نیا طریقۂ استعمال، ایک نیا فائدہ دریافت ہوتا ہے ــ سوائے میرے! تمہارے سامنے کی بات ہے۔ کہہ دو، یہ بھی جھوٹ ہے۔ پرسوں دوپہر اخبار پڑھتے پڑھتے ذرا دیر کو آنکھ لگ گئی۔ کُھلی تو عینک غائب۔ تم سے پوچھا تو اُلٹی ڈانٹ پڑی" ابھی سے کا ہے کو اُٹھ بیٹھے۔ کچھ دیر اور سولو۔ ابھی تو گڈّو میاں تمہارا بائی فوکل لگائے اندھا بھینسا کھیل رہے ہیں! بالکل اپنے باپ پر پڑے ہیں۔" بچّے سبھی کے ہوتے ہیں۔ مگر گھر کا گھروایا کہیں نہیں ہوتا۔ صبح دیکھو تو سگریٹ لائٹر کی لَو پر ہنڈ کلیا پکائی جا رہی ہے۔ شام کو خود بیگم صاحب گیلے بال بکھیرے، پندرہ گز گھیر کی شَلوار میں ہماری پینسل سے سَٹ سَٹ کمر بند ڈال رہی ہیں۔

سُرخ چُوڑیاں چَھنکا کر سُہاگ راگ چھیڑتے ہوئے بولیں، ہائے اللہ! دفتر کا غُصّہ گھر والوں پر کیوں اُتار رہے ہو؟ کسی نے تمہاری پنسل سے کمر بند ڈالا ہو تو اس کے ہاتھ ٹُوٹیں۔ میں نے تو تمہارے "پار کر" سے ڈالا تھا! چاہے جس کی قسم لے لو۔ رہے بچے، تو ان کے نصیب میں

تمہاری استعمال کی ہوئی چیزیں ہی لکھی ہیں۔ پھر بھی آج تک ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے چیز واپس وہیں نہ رکھی ہو۔ ہم نے کہا یقین نہ ہو تو خود جا کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ لو۔ سیفٹی ریزر کا بلیڈ غائب ہے۔ بولیں، کم از کم خُدا سے تو ڈرو۔ ابھی ابھی میرے سامنے نبیلہ نے پنسل چھیل کر واپس ریزر میں لگایا ہے۔ وہ بچاری خود احتیاط کرتی ہے!

مرزا نے موضع چاکسُو (خورد و کلاں) کے نیم بُزرگوں کی انجمن کی داغ بیل ڈالی تو ہفتوں اس تذبذُب میں رہے کہ نام کیا رکھا جائے۔ پروفیسر قاضی عبد القُدُّوس ایم۔ اے۔ (گولڈ میڈلسٹ) نے "انجمنِ افسُردہ دلانِ چاکسُو، رجسٹرڈ" تجویز کیا جو اس بِنا پر مُسترد کر دیا گیا کہ ممبری کا دار و مدار محض افسُردہ دلی پر رکھا گیا تو چاکسو کے تمام شاعر مع غیر مطبوعہ دیوان گُھس آئیں گے۔ خاصی بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ اس غول کہولاں کا نام "بائی فوکل کلب" نہایت موضوع رہے گا کہ بائی فوکل ایک لحاظ سے تمام دنیا کے ادھیڑوں کا قومی نشان ہے۔انسان کی فطرت بھی ایک طُرفہ تماشا ہے۔ بوڑھا ہو یا بچّہ، نوجوان ہو یا ادھیڑ، آدمی ہر منزل پر اپنی عمر کے باب میں جھوٹ ہی کو ترجیح دیتا ہے۔ لڑکے اپنی عمر دو چار سال زیادہ بتا کر رُعب جماتے ہیں۔ یہی لڑکے جب نامِ خُدا جوان ہو جاتے ہیں تو نوجوان کہلانا پسند کرتے ہیں۔ جو ادھیڑ مرد نسبتاً راست گو واقع ہُوئے ہیں، وہ اپنی عمر دس برس کم بتاتے ہیں۔ عورتیں ہمیشہ سچ بولتی ہیں ــــ وہ ایک دوسرے کی عمر ہمیشہ صحیح بتاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خون، مُشک، عشق اور ناجائز دولت کی طرح عمر بھی چھپائے نہیں چھپتی۔ بائی فوکل، السر، بد نظری، گاف، نئی نسل سے بیزاری، رقیقُ القلبی اور آسودہ حالی ــــ یہ عمرِ وسطیٰ کی جانی پہچانی نشانیاں ہیں۔ ان سات صفات میں سے چھ کی بِناء پر (یعنی آسودہ حالی کو چھوڑ کر) جو ہماری ذات کے کوزے میں بند ہوگئی تھیں، ہمیں بلا مُقابلہ بائی فوکل کلب کا سیکریٹری جنرل منتخب کیا گیا۔
کلب کی رُکنیت کی بنیادی شرط یہ ہے کہ آدمی چالیس سال کا ہو۔ اور اگر خود کو اس سے بھی زیادہ محسوس کرتا ہو تو کہنا ہی کیا۔ حضرت حفیظ جالندھری کے الفاظ میں یہ وہ عجب مرحلہء عمر ہے کہ آدمی کو

ہر بُری بات، بُری بات نظر آتی ہے !

یہ وہ دورِ عافیت ہے جب آدمی چاہے بھی تو نیکی کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ انڈونیشیا کے سابق صدر سوئیکارنو کا قول ہے کہ تیس بہاروں کے بعد ربر کا درخت اور بِنتِ حوّا کسی مصرف کے نہیں رہتے، جبکہ مرد کسی عمر میں حُسن سے مامُون نہیں۔ ایسے مقُولے کی تردید یا تائید ہمارے بس کا کام نہیں۔ سوئیکارنو تو بُزرگ مردُم دیدہ و زن گزیدہ ہونے کے علاوہ صدارت کے صدمے بھی اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہم تو ان سے بھی محروم ہیں۔ پھر یہ کہ چھوٹے منھ کو بُری بات زیب بھی نہیں دیتی۔ ربر کے بارے میں ہم ابھی صرف اتنا دریافت کر پائے ہیں کہ غلطیوں کو مٹانے کے لئے خاصی کارآمد چیز ہے۔ رہی صنفِ نازُک، سو اپنے محتاط تجربے و مُشاہدے کی بناء پر ہم کوئی خوبصورت جھوٹ نہیں بول سکتے۔ شیرنی کو کچھار میں کُلیلیں کرتے دیکھنا اور بات ہے اورسرکس کے پنجرے میں بینڈ کی دُھن پر لوٹیں لگاتے ہوئے دیکھنا اور بات۔

البتّہ اپنے ہم جنسوں کے بارے میں بہت سے بہت کہہ سکتے ہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ سائیں سائیں کرتا ریگستان جو راتوں رات جیتی جیتی زمین کو نگلتا چلا جاتا ہے، وہ لق و دق صحرائے اعظم جو سن رسیدہ سینوں میں دما دم پھیلتا رہتا ہے، وہ کسی بھی لمحے نمودار ہو سکتا ہے کہ دل آنکھ سے پہلے بھی بوڑھے ہوجایا کرتے ہیں۔ اس ہُو کے صحرا میں گونج کے سوا کوئی صدا، کوئی نِدا سنائی نہیں دیتی اور کیکٹس کے سوا کچھ

نہیں لگتا۔ مرزا اس بنجر، بے رس، بے رنگ، بے امنگ دھرتی کو No Woman's Land کہتے ہیں، جس کی ملی جلی سرحدیں صرف بائی فوکل سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ بڑھتے ہوئے سایوں اور بھینی بھینی یادوں کی سر زمین ہے جس کے باسی پیاس کو ترستے ہیں اور بے پیاس پیتے ہیں کہ انہیں

اس کا بھی مزا یاد ہے، اس کا بھی مزا یاد

ایک دن ہمیں اوپر کے شیشے سے صفحہ نمبر اور نچلے سے فُٹ نوٹ پڑھتا دیکھ کر مرزا مُنہ اوپر نیچے کر کے ہماری نقل اُتارنے لگے۔ حاضرین کو ہمارے حال پر خوب ہنسا چکے، تو ہم نے جل کر کہا، اچھا، ہم تو محض نیک چلنی کی وجہ سے قبل از وقت اندھے ہو گئے، لیکن تم کس خوشی میں یہ بوتل کے پیندے جتنی موٹی عینک چڑھائے پھرتے ہو؟ فرمایا، مگر یہ بائی فوکل نہیں ہے۔ ہم نے کہا، تو کیا ہوا؟ جس عینک سے تم مُنہ اندھیرے تفسیرِ ماجدی کی بِل بِل کے تلاوت کرتے ہو، اسی سے رات ڈھلے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ستر کُشا کیبرے دیکھتے ہو! فرمایا برخوردار! اسی لئے آج تک ہمارا دل سالم ہے!

اور یہ بڑی بات ہے۔ اس لئے کہ مرزا (جو بیس سال سے خود کو مرحوم کہتے اور لکھتے آئے ہیں) اب تک چھوٹے بڑے ملا کر 37 مُعاشقے کر چکے ہیں۔ ہر محبوبہ کی یاد کو 'لیبل' لگا کر اس طرح رکھ چھوڑا ہے جیسے فُٹ پاتھ پر مجمع لگا کے دوائیں بیچنے والے زہریلے سانپوں اور بچھوؤں کو اسپرٹ کی بوتلوں میں لئے پھرتے ہیں۔ ان مُعاشقوں کا انجام وہی ہوا جو ہونا چاہیے، یعنی ناکامی۔ اور یہ اللہ نے بڑا فضل کیا، کیونکہ خُدا نخواستہ وہ کامیاب ہو جاتے تو آج مرزا کے فلیٹ میں 37 نفر دُلہنیں بیٹھی بلکہ کھڑی ہوتیں۔ لیکن پے در پے ناکامیوں سے مرزا کے پائے حماقت میں ذرا لغزش نہ آئی۔ دو چار ٹانگیں ٹوٹنے سے کھنکھجورا کہیں لنگڑا ہوتا ہے؟ 32 ویں ناکامی کا البتّہ قلب نے بڑا اثر لیا۔ اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ راوی کے ریلوے پُل سے چھلانگ لگا کر خودکُشی کرلیں۔ لیکن اس میں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں پہلے ہی ٹرین سے نہ کٹ جائیں۔ مُتواتر تین چار شب دوسرا سنیما شو بھی اس سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دیکھنے گئے کہ واپسی میں مال پر اُنہیں کوئی بے دردی سے قتل کر دے۔ لیکن کسی غُنڈے نے جاگتی جگمگاتی سڑک پر ان کے فاسِد سے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگے۔ سِتم یہ کہ کسی نے وہ جیب تک نہ کاٹی، جس میں وہ حفاظتی پستول بھی چھپاکر لے جاتے تھے۔ سب طرف سے مایوس ہوکر انہوں نے حضرت داتا گنج بخش کی درگاہ کا رخ کیا کہ اُسی کا مینار سب سے بلند و قریب پڑتا تھا۔ مگر وہاں دیکھا کہ عُرس ہو رہا ہے۔ آدمیوں پر آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ موسم بھی کچھ مُناسب سا ہے۔ چنانچہ فی الحال ارادہ مُلتوی کر دیا اور بانو بازار سے چاٹ کھا کر واپس آ گئے۔

ذرا اتّفاق تو دیکھیے کہ دو دن بعد یہ مینار ہی گرگیا۔ مرزا نے اخبار میں خبر دیکھی تو سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔ بڑی حسرت سے کہنے لگے، صاحب! عجیب اتّفاق ہے کہ میں اس وقت مینار پر نہیں تھا۔ برسوں اس کا قلق رہا۔

اپنی اپنی فکر اور اپنی اپنی ہمّت کی بات ہے۔ ایک ہم ہیں کہ جو راتیں گُناہوں سے توبہ و استغفار میں گُزرنی چاہئیں، وہ اب اُلٹی ان کی حسرت میں ترستے پھڑکتے بیت رہی ہیں۔ نین کنول کھلے بھی تو پچھلے پہر کی چاندنی میں۔ اور ایک مرزا ہیں کہ نظر ہمیشہ نیچی رکھتے ہیں، لیکن حسینانِ شہر میں سے آج بھی کوئی سلوک کرے اس سے انکار نہیں۔ انہی کا قول ہے کہ آدمی بو الہوسی میں کمزوری یا کاہلی دکھائے تو نِری عاشقی رہ

جاتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ حالات کیسے ہی نہ مُساعِد ہوں، بلکہ اگر بالکل نہوت ہے، لیکن طبیعت حاضر ہے تو مرزا سنگلاخ چٹانوں سے جوئے شیر ہی نہیں، خود شیریں کو بر آمد کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ بلکہ ایک آدھ دفعہ تو یہ چوٹ بھی ہوئی کہ کوہِ کُندن، کو ہکن برآوردن! ۱۹۵۸ کا واقعہ ہے۔ ہمارے اصرار پر بے بی شو (شیر خوار بچوں کی نمائش) میں جج بننا منظور کیا اور وہاں ایک والدہ پر عاشق ہو گئے۔ پہلا انعام اسی کو دیا۔

۴ اگست ٦٦۔ دوپہر کا وقت۔ دن پہلے پیار کی مانند گرم۔ بدن کوری صُراحی کی طرح رس رہا تھا۔ ہم گَرد اُڑاتے، خاک پھانکتے مرزا کو اکتالسویں سال گرہ کی مبارکباد دینے گُل برگ پہنچے۔ مرزا کراچی سے نئے نئے لاہور آئے تھے اور مُقامی 'کلر اسکیم' سے اس درجہ اختلاف تھا کہ سفیدے کے تنوں کو نیلا پینٹ کروا دیا تھا۔ ان کے بیرے نے برآمدے سے ہی ہانک لگائی کہ صاحب جی! وہ جو موٹر سائکل رِشکا کے آگے ایک چیز لگی ہوتی ہے، صِرپھ اُس پر بیٹھ کے ایک صاحب ملنے آئے ہیں! لیکن مرزا نے نہ یہ اعلان سُنا اور نہ ہماری موٹر سائکل کی پھَٹ پھَٹ، اس لئے کہ اس وقت وہ سالگرہ کے مرغّن لنچ کے بعد آرام کرسی پر آنکھیں بند کے 'کیس نمبر 29' کو آغوشِ توجّہ میں لئے بیٹھے تھے۔ ہم نے شانہ جھنجھوڑ کر مداخلتِ بجا کرتے ہوئے کہا، مرزا! عجیب بات ہے۔ ہر سالگرہ ہماری عینک کے نمبر اور بے دلی میں اضافہ کرجاتی ہے اور ہمیں ہر شے میں ایک تازہ دراڑ پڑی نظر آتی ہے۔ مگر تم ہو کہ آج بھی ستاروں پر کمند ڈالنے کا حوصلہ رکھتے ہو۔ بولے، شکریہ! نطشے کا فیضان ہے۔ ہم نے کہا مگر ہمارا مطلب فلمی سِتاروں سے تھا! فوراً شکریہ واپس لیتے ہوئے فرمایا "Et Tu Brutus"

دو چار برس کی بات نہیں، ہم نے مرزا کا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب

گھنگھور گھٹا تُلی کھڑی تھی
پر بُوند ابھی نہیں پڑی تھی

ابھی وہ اس لائق بھی نہیں تھے کہ اپنے ٹوپاں طوطے کی کفالت کر سکیں، لیکن دلِ نا صبور کا یہ رنگ تھا کہ الجبرا کے گھنٹے میں بڑی محویت سے اپنے ہاتھ کی ریکھاؤں کا مطالعہ کرتے رہتے۔ عمر کی لکیر ان کی ذاتی ضرورت سے کچھ لمبی ہی تھی۔ مگر شادی کی فقط ایک ہی لائن تھی، جسے رگڑ رگڑ کے دیکھتے تھے کہ شاید پچھلے چوبیس گھنٹوں میں کوئی شاخ پھوٹی ہو۔ مدّت العُمر متعدّد خاندانی بُزرگ ان کی جوانی پر سائے فگن رہے۔ بارے ان کے گھنے گھنے سائے سر سے اُٹھے تو پتہ چلا کہ دنیا اتنی بُری جگہ نہیں۔ لیکن ایک مدّت تک مالی حالات نے رُخصتِ آوارگی نہ دی اور جی مار مار کے رہ گئے۔ ورنہ ان کا بس چلتا تو بچی کھچی متاعِ عمر کو اس طرح ٹھکانے لگا دیتے، جیسے دلّی کے بادشاہ لدے پھندے باغ لونڈیوں سے لُٹوا دیا کرتے تھے۔ مرزا 1948 تک مرزایانہ بسر کرتے رہے۔ یعنی مزاج رئیسانہ اور آمدنی فقیرانہ رکھتے تھے۔ شادی کی ہمّت نہیں پڑتی تھی۔ خُدا بھلا کرے پروفیسر قاضی عبد القُدُّوس کا، جنھوں نے اپنی ہتھیلی پر ایک دن قلم سے ضرب تقسیم کر کے مرزا کو اعداد و شُمار سے قائل کر دیا کہ جتنی رقم وہ سگریٹوں پر پھونک چکے ہیں، اس سے سنگھڑ شوہر چار دفعہ مہر بیباق کرسکتا تھا۔ آخر ہم سب نے لگ لپٹ کر ان کی شادی کروا دی۔ دو چار دن تو مہرِ مُعجّل کی دہشت سے سہمے سہمے پھرے اور جیسے تیسے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا، لیکن ہنی مون کا ہفتہ ختم ہونے سے پہلے اس حد تک نارمل ہو گئے کہ بے تکلُّف دوستوں کو چھوڑ لیے، خود نئی نویلی دُلہن کی زبان پر بھی یوں ہی کوئی زنانہ نام آگیا تو مرزا تڑپ کر مُجسّم سوال نامہ بن گئے:

کہاں ہے؟ کس طرف ہے؟ کدھر ہے؟

انہی کے ایک برادرِ نسبتی سے روایت ہے کہ عین آرسی مصحف کے وقت بھی آئینے میں اپنی دُلھن کا مُنہ دیکھنے کے بجائے مرزا کی نگاہیں اس کی ایک سہیلی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ دُنیا گواہ ہے (دُنیا سے یہاں ہماری مُراد وہی ہے، جو مرزا کی، یعنی عالمِ نِسواں) کہ مرزا نے جس پہ ڈالی، بُری نظر ڈالی، سوائے اپنی بیوی کے۔ موصُوف کا اپنا بیان ہے کہ بندہ شیرخوارگی کے عالم میں بھی بیس سال سے زیادہ عمر کی آیا کی گود میں نہیں جاتا تھا۔ کبھی کبھی اپنی ندیدی آنکھوں سے خود پناہ مانگنے لگتے تھے۔ زُکام کے سہ ماہی حملے کے دوران ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کئی بار وصیّت کر چکے ہیں کہ میں مرنے لگوں، تو لِللہ ایک گھنٹہ پہلے میری عینک اُتار دینا، ورنہ میرا دم نہیں نکلے گا۔ ہم نے ایک دفعہ پوچھا مرزا! ہمیں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ تمہارے دشمنوں کے مرنے میں اب ایک گھنٹہ رہ گیا ہے؟ بولے، جب میں نرس سے ڈیوٹی کے بعد کا فون نمبر پوچھنے کے بجائے اپنا ٹمپریچر پوچھنے لگوں، تو سمجھ لینا کہ تمہارے یارِ جانی کا وقت آن لگا ہے!

مگر مرزا کی باتیں ہی باتیں ہیں۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ ان کے سینے میں جو بانکا سجیلا ڈانؔ جُوان دھومیں مچایا کرتا تھا، وہ اب پچھلے پہر دوہرا ہو ہوکر کھانسنے لگا ہے۔ اب وہ آتش دان کے سامنے کمبل کا گُھونگھٹ نکالے، کپکپاتی آواز میں اپنے نیاز مندوں کو اس عہد رنگیں کی داستانیں سُناتے ہیں جب وہ علی الصُّبح Fridge کے پانی سے نہایا کرتے تھے۔ وہ تو یہاں تک شیخی مارتے ہیں کہ آج کل کے مُقابلے میں اس اس زمانے کی طوائفیں کہیں زیادہ بد چلن ہوا کرتی تھیں۔

مرزا کا ذکر، اور پھر بیاں اپنا! سمجھ میں نہیں آتا کس دل سے ختم کریں۔ لیکن کلب کے سرپرستِ اعلیٰ فہیم اللہ خان کا تعارُف رہا جاتا ہے۔ یہ انہی کے دم قدم بلکہ دام و درم کا ظہور ہے جس نے چاکسُو خورد و کلاں کے تمام ادھیڑوں کو بغیر کسی مقصد کے ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ خان صاحب ہر نسل کی امریکی کار اور گھوڑوں کے دلدادہ ہیں۔ آخرُ الذّکر کی رفتار و کردار سے اتنے متاثّر ہیں کہ کسی حسین خاتون کی انتہائی تعریف کرنی مقصود ہو تو اسے گھوڑی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اوروں پر بہت ہُوا تو رزق کا ایک دروازہ کُھل جاتا ہے۔ ان پر پوری بارہ دری کُھلی ہُوئی ہے۔ اور وہ بھی روز اوّل سے۔ ورنہ ہونے کو تو فارغُ البالی ہمیں بھی نصیب ہوئی، مگر بقول شاعر

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

ہم جب چوتھی جماعت میں پہنچے تو ان کے بڑے صاحبزادے میٹرک میں دوسری دفعہ فیل ہو چکے تھے۔ لیکن پیری کا احساس تو کُجا، جب سے ہم نے بائی فوکل لگایا ہے، ہمیں اپنی تازہ ترین یعنی ماہ رواں کی منظورِ نظر سے "انکل" کہلوا کر حسینوں کی نگاہ میں ہماری عزّت اور عمر بڑھاتے ہیں۔ جس مقام پر اب ہم لاحول پڑھنے لگ گئے ہیں، وہاں ان کی زبان ابھی تک سُبحان اللہ سُبحان اللہ کہتے سوکھی جاتی ہے۔ ہم نے ان کی جوانی کی گرمیاں نہیں دیکھیں۔ ہاں، بڑے بوڑھوں سے سُنا ہے کہ جب موصُوف کی جوانی محلّے کی دوشیزاؤں کے والدین پر گراں گُزرنے لگی تو انہوں نے ہم سایوں کے در و دیوار پہ حسرت سے نظر کر کے چاکسُو خورد کو خیرباد کہا اور بمبئی کا رُخ کیا، جہاں اُون کی آڑھت کے ساتھ ساتھ 1947 تک کئی اونچے گھرانوں کی روشن خیالی پر متصرّف رہے۔ مرزا کا کہنا ہے کہ ان کا دل شروع ہی سے بہت بڑا تھا۔ ان کا مطلب ہے کہ اس میں بیک وقت کئی مستُورات کی سمائی ہو سکتی تھی۔ خُوب سے خُوب تر کی جُستجو انہیں کئی بار قاضی کے سامنے بھی لے گئی۔ اور ہر نکاح پہ پھر پھر کے جوانی آئی کہ یہ

عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لیے

ان کے قہقہے میں جو گونج اور کمک ہے، وہ سندھ کلب کے انگریزوں کی صُحبت اور وہیں کی وہسکی سے کشید ہوئی ہے۔ خوش باش، خوش لباس، شاہ خرچ۔ نا جائز آمدنی کو انہوں نے ہمیشہ نا جائز مد میں خرچ کیا۔ دھوپ گھڑی کی مانند جو صرف روشن ساعتوں کا شُمار رکھتی ہے۔ قومی ہیکل، چوڑی چھاتی، کھڑی کمر، کندھے جیسے خربوزے کی پھانک، کُھلتی برستی جوانی۔ اور آنکھیں؟ ادھر دو تین سال سے عینک لگانے لگے ہیں، مگر دھوپ کی۔ وہ بھی اس وقت جب سینڈز پٹ کے لباس دشمن ساحل پر غُسل آفتابی کے نظّارے سے ان کی گدلی گدلی آنکھوں میں ایک ہزار "اسکینڈل پاور" کی چمک پیدا ہو جاتی ہے اور وہ گھنٹوں کسی کو نظروں سے غُسل دیتے رہتے ہیں۔ پاس کی نظر ایسی کہ اب تک اپنی جوان جہان پوتیوں کے نام کے خط کھول کر بغیر عینک کے پڑھ لیتے ہیں۔ رہی دور کی نظر، سو جتنی دور نارمل آدمی کی نظر جا سکتی ہے، اتنی دور بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔

***